(غلام گردش)

ڈیڈ باڈی

کراچی سے لاہور آنے کیلئے پی آئی اے کا درمیانہ سا طیارہ اُڑنے کیلئے تیار تھا۔ جہاز کے دروازے بند ہونے کے قریب تھے۔ روسی پائلٹ عجیب طریقے سے انگریزی بول کر موسم اور سفر کے دورانیے کے متعلق بات کر رہا تھا۔ ہر جملے کے بعد "انشاء اللہ" کہتا تھا۔ اسے کسی معتبر آدمی نے سمجھایا ہوگا کہ پاکستانی قوم ہر فقرے کے بعد مخصوص انداز میں یہ الفاظ ضرور استعمال کرتی ہے۔ بہر حال جہاں جملے کے بعد صرف خاموش رہنا چاہیے تھا، روسی پائلٹ ضرور انشاء اللہ کہتا تھا۔ کیبن کے فضائی عملہ میں ایک ویت نامی اور ایک فلپائنی خاتون تھی۔ احساس ہوا کہ ہم ہر معاملہ میں دوسری قوموں کے حد درجہ محتاج ہو چکے ہیں۔ کہاں وہ ماضی کی پی آئی اے، جس نے متعدد فضائی کمپنیوں کو کاروبار کے آداب سکھائے تھے اور کہاں یہ کرائے پر لیے گئے ہوائی جہاز جس کے فضائی عملہ میں پاکستانی نہ ہونے کے برابر تھے۔ پی آئی اے نے کرائے پر جہاز لیکر اپنا قومی بھرم مزید کم کر دیا ہے۔ خیر بھرم تو اب یہاں کسی شخص، ادارے یا سیاسی مسخرے کا نہیں رہا۔ اگر کسی نے "تنزلی" لفظ کا مطلب سمجھنا ہے، تو فوری طور پر پاکستان کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں بدقماش حد درجہ معتبر ہیں۔ شرفاء کونے کھدروں میں عزت اور جان بچا کر پھٹی آنکھوں سے سب تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

دروازہ بند ہونے سے ڈیڑھ منٹ پہلے حد درجہ پریشان حال شخص اندر داخل ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا جہاز کی آخری نشست پر بیٹھ گیا۔ جہاز چلنے سے پہلے بوجھل قدموں کے ساتھ ایئر ہوسٹس کے پاس گیا۔ ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ ایئر ہوسٹس نے قہر آلود نظروں سے اس اجنبی شخص کو دیکھا اور بتایا کہ جاؤ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ جاؤ۔ مگر مسافر وہیں کھڑا رہا۔ عجیب دکھ بھرے انداز میں کاغذ فضائی میزبان کی آنکھوں کے سامنے رکھا اور پوچھنے لگا کہ کیا میرے والد کی ڈیڈ باڈی جہاز میں پہنچ چکی ہے؟ جہاز میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ایئر ہوسٹس نے کاغذ لیا اور برسر کے پاس گئی۔ بتایا کہ ایک مسافر پوچھ رہا ہے کہ کیا کوئی میت جہاز میں رکھ دی گئی ہے۔ برسر تیزی سے مسافر کی طرف آیا اور اسے اطمینان دلوایا کہ ہاں، تابوت مسافروں کے سامان رکھنے والے حصے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ ادھیڑ عمر شخص نے کھوئے ہوئے انداز سے کہا، کہ لندن سے آ رہا ہے۔ پچھلے سفر میں عملہ کی غلطی کی وجہ سے تابوت جہاز تک پہنچ نہ پایا تھا اور وہ ایئر پورٹ پر دو دن تکلیف میں انتظار کرتا رہا۔ کیونکہ ڈیڈ باڈی کو پاکستان لانے کے تمام سرکاری معاملات طے نہیں ہوئے تھے۔ یقین ہونے پر مسافر اپنی نشست کی طرف چلا گیا۔ اجنبی شخص کی باتیں تھوڑی دیر بعد سب بھول گئے۔ وہی عامیانہ سی روٹین، وہی سیٹوں کے درمیان کھانے پینے والی ٹرالی، وہی چائے یا کافی کی آواز۔ مگر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا ذہنی طور پر منجمد سا ہو گیا۔ ہوائی مسافروں کا سامان بنیادی طور پر ایک ایسے کھلے خانے میں رکھا جاتا ہے جو جہاز کے مسافروں کے قدموں کے نیچے ہوتا ہے۔ عملی طور پر ہم تمام لوگ اپنے سامان کے اوپر بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔ احساس نہیں ہوتا کہ ہمارے بیگ، سوٹ کیس اور سفری سامان ہمارے ہی پیروں کے نیچے پڑا ہے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس سامان میں ایک شخص کی نعش بھی ہے۔ ایک بے جان باڈی جو لندن میں غلطی سے سوار نہ کروائی جا سکی اور اب خاموشی سے لاہور کی طرف جا رہی ہے۔ ایک بے روح انسان کے تابوت سے ذرا سا اوپر بیٹھ کر سفر کرنا بہت مشکل

لگا۔لاہور آنے پر،سارے مسافر اپنا اپنا سامان بیلٹ سے اٹھانے میں مصروف ہو گئے۔غور سے دیکھا تو اجنبی مسافر سامان اُٹھانے والوں میں شامل نہیں تھا۔معلوم ہوا کہ باڈی کو ایک گاڑی میں علیحدہ رکھ کر ائیر پورٹ کے مختص دروازے سے باہر نکالا جاتا ہے۔کوشش ہوتی ہے کہ عام مسافروں سے دور اور انکی آنکھوں سے اوجھل طریقے سے تابوت کو باہر لایا جائے۔سوچتا ہوا ائیر پورٹ سے باہر نکلا اور دفتر آ گیا۔مگر ذہن میں بار بار، مسافر کے کہے ہوئے لفظ آسمانی بجلی کی طرح آ رہے تھے۔کیا میرے والد کی ڈیڈ باڈی جہاز میں پہنچ چکی ہے۔اس شخص کا غم زدہ چہرہ بھی سامنے گردش کر رہا تھا۔اپنے ذہن سے مفر حاصل کرنے کیلئے دفتر سے اُٹھ کر جلدی واپس آ گیا۔سوال کو بھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

اب احساس کی مختلف سمت جا کر ایک اور زاویہ سے انسانی زندگی اور موت کی طرف دیکھتا ہوں۔1979 میں جب میڈیکل کالج گیا تو سب سے پہلا مضمون اَناٹومی کا تھا۔انتہائی مشکل اور دقیق کتابیں۔بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ اَناٹومی یعنی انسانی جسم کی جزئیات کی سائنس کے اکثر عنوان اور نام قدیم یونانی زبان میں ہیں۔یہ لفظ شروع ہی اتنے مشکل لگتے ہیں کہ انسان سمجھتا ہے کہ کبھی بھی اَز بر نہیں ہونگے۔مگر تھوڑے سے عرصے میں یہ مشکل ترین جملے اور لفظ عام فہم زبان کے حصے بن جاتے ہیں۔میڈیکل کے تمام طالبعلموں کیلئے اَناٹومی کا مضمون شروع میں کافی مشکلات پیدا کرتا ہے۔مگر اصل مسئلہ اس مضمون کی عملی تربیت کا ہے۔یہ تعلیم و تربیت کہیں اور نہیں ہوتی بلکہ انسان کے مردہ جسم پر کی جاتی ہے۔کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے اَناٹومی ہال میں پہلے دن جب پوری کلاس پہنچی تو تمام خوف زدہ تھے۔پورے ہال میں لوہے کی درجنوں ٹیبلیں پڑی ہوئی تھیں۔ہر ٹیبل پر ایک انسان کی لاش دھری ہوئی تھی۔آج تک یاد ہے کہ کلاس کا ایک طالبعلم یہ سب کچھ دیکھ کر بیہوش ہو کر فرش پر گر گیا تھا۔اسے بڑی مشکل سے ہال سے باہر لیجایا گیا تھا۔جب پروفیسر تقیہ نے حکم دیا کہ اب اپنے نصاب کے حساب سے لاشوں کو پڑھنا شروع کر دو تو بہت مشکل لگا۔کسی کو ہاتھ کے ریشے، ہڈیاں اور پٹھے پڑھنے تھے تو کسی کو پیٹ کے اندر پوشیدہ اعضاء۔بدبو سے سب کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ہاتھوں میں چاقو جیسے اوزار لیکر جسم کو ہر جگہ سے کاٹنا تھا اور اسکے بعد ٹیچر کے سامنے اسے کتاب کے مطابق پڑھنا تھا۔ہر ایک کو ایک سیال مادہ یعنی فارملین کی بوتل دی گئی تھی۔اسکو ہر عضاء پر لگانا ہوتا تھا۔یہ دوائی بذات خود اتنی بدبودار تھی کہ برداشت کے سارے بند ٹوٹ جاتے تھے۔مگر یہ ضروری تھی۔اگر آپ ایک دن یہ مردہ جسم پر نہ لگائیں، تو اگلے دن اس حصے پر سفید رنگ کے کیڑے ہی کیڑے نظر آتے تھے۔دو تین ہفتے مشکل سے گزرے۔مگر اسکے بعد یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ ہم لوگ مردہ انسانی جسموں کے درمیان وقت گزار رہے ہیں۔اب ہمارے لیے یہ سب کچھ تعلیمی معمول تھا۔کسی کو یاد ہی نہیں تھا کہ ہمارے درمیان پڑے ہوئے بے روح لوگ، صرف چند دن، ہفتے یا مہینے پہلے بالکل ہماری طرح زندہ تھے۔ہماری طرح کھانا کھاتے تھے۔ہماری طرح نہاتے تھے۔انہیں بھی ہم لوگوں کی طرح غم تھے، خوشیاں تھیں، تہوار تھے۔پر نہیں، ہم تمام طالبعلموں کیلئے یہ سب کچھ کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ہمارے اردگرد صرف اور صرف "ڈیڈ باڈیز" تھیں۔بولنے، سوچنے اور چلنے سے محروم مٹی کے پتلے۔جنکی شکلیں بھی بے معنی تھیں اور جسم بھی۔جنکی پرانی زندگی کا کسی کو بھی کوئی علم نہیں تھا۔انکے مردہ جسم بغیر کسی تدفین کے میڈیکل کالج کے اَناٹومی ہال میں تعلیم کے کام آ رہے تھے۔دو سال کے دورانیے میں معلوم ہوا، کہ ان میں سے اکثریت بے گھر لوگ ہوتے

ہیں۔ جو سڑکوں پر دم توڑ دیتے ہیں۔ جنکا کوئی والی وارث نہیں ہوتا۔ جو مرتے ہوئے کسی بھی رشتے سے محروم ہوتے ہیں۔

پی آئی اے میں لدی ہوئی ڈیڈ باڈی تو لاوارث نہیں تھی۔ اسکا بیٹا غم اور تھکن کی تصویر بنے جہاز میں موجود تھا۔ تابوت سے صرف چند انچ یافٹ اوپر درجنوں مرد اور خواتین مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی دوبارہ سینڈوچ مانگ رہا تھا تو کوئی ائیر ہوسٹس کو بار بار چائے کا تقاضا کر رہا تھا۔ کوئی سیٹ سے اُٹھ کر واش روم جا رہا تھا اور کوئی اپنے ساتھ والے مسافر سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ ساتھ والی نشست پر پی آئی اے کا ایک پائلٹ بیٹھا ہوا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس کراچی سے لاہور کی طرف محوسفر تھے۔ ساتھ والی نشست پر ماضی کی ایک اداکارہ کو جہاز کی اُڑان اور کمپنی کے مسائل بتا رہا تھا۔ پوری کوشش تھی کہ اداکارہ کو متاثر کر لے۔ وہ شخص ایک سیکنڈ کیلئے بھی خاموش نہ ہوا۔ اگلی نشستوں پر گالف کھیلنے کیلئے دس بارہ مسافر لاہور جا رہے تھے۔ آپس میں ہنسی مذاق اور لطیفے سنائے جا رہے تھے۔ جم خانہ لاہور کے گالف کلب کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اکثر کھلاڑی میچ میں شرط لگا کر پیسے جیتنے کی بات کر رہے تھے۔ ہر ایک دوسرے کو بتا رہا تھا کہ اس کا گالف کھیلنے کا سیٹ کتنا قیمتی ہے اور کس ملک سے خریدا تھا۔ مکمل خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی نوجوان ساکت اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ غم اسکے چہرے سے باہر جھلک رہا تھا۔

ذہن میں صرف ایک سوال آیا کہ کیا اس نوجوان کے علاوہ کسی کو احساس ہے کہ ہم ایک تابوت کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جواب نفی میں تھا۔ مسافروں نے بالکل سن لیا تھا کہ ایک ڈیڈ باڈی بھی انکی ہم سفر ہے۔ مگر سب بالکل آرام سے زندگی کی ہر وہ چیز کرنے میں مصروف تھے، جسے وہ سالہا سال سے مسلسل کرتے آ رہے ہیں۔ کیا ان میں کسی کو بھی احساس تھا کہ زندگی اور موت میں اتنا کم فرق ہے کہ وہ بھی کسی جہاز، ایمبولینس، کار، بستر یا دفتر میں ڈیڈ باڈی بن سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اصل میں ہم سارے پی آئی اے کی اس فلائٹ کے مسافروں کی طرح ہیں جو دراصل اپنے اپنے تابوتوں پر بیٹھے زندگی کا سفر گزارنے میں مصروف ہیں۔ اس حقیقت سے بے نیاز کہ اپنے اختتام سے تھوڑا سا ہی دور رہ گئے ہیں۔ ہر ایک کا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے ہرگز ہرگز نہیں مرنا، ڈیڈ باڈی میں تبدیل ہونے والا تو کوئی اور ہی ہوگا۔ مگر یہ خیال نہ صرف خام ہے بلکہ کسی حد تک فریب بھی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے ڈیڈ باڈی میں تبدیل ہونا ہے اور کسی اجنبی سفر پر گامزن ہو جانا ہے۔ اس سفر کا کیا نام ہے۔ کچھ نہیں کہہ سکتا!

راؤ منظر حیات